The Presentation Of Culture and Civilization In Short Stories Of Bano Qudsia

بانو قدسیہ کے افسانوں میں تہذیب و ثقافت کی پیش کش

Maryam Akram Khan*[1]
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Govt College University, Faisalabad
Dr.Rabia Sarfraz*[2]
Associate Professor, Department of Urdu, Govt College University, Faisalabad

[1]* مریم اکرم خان

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

[2]*ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Correspondance: drrabiasarfraz@gcuf.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 03-02-2025
Accepted:18-03-2025
Online:28-03-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Bano Qudsia, the author of Raja Gidh, is one of the most prominent and influencial figure in Urdu Literature. She started her creative journey as a fiction writer and gained immense popularity all over Pakistan for her novel Raja Gidh. Besides winning accolades for her novels, she also reaped the awards for her writing in other generes as well. Being a well known writer for television plays in both Urdu and Punjabi language, Bano Qudsia is also acknowledged as a cutting adge trendsetter who gave a fresh perspective to the Pakistani television plays. Her popularity and successful television plays also earned recognition and admiration across the boarder. Bano Qudsia is also recognised for her pragmatic, rational and optimistic attitude towards life that can be mirrored in her novels, short stories and quotations.

KEYWORDS: Bano Qudsia, Raja Gidh, Pakistani Television Plays, Urdu Literature, Fiction Writer

بانو قدسیہ اردو ادب کا ایک منفرد، نمایاں اور معتبر نام ہیں جنہوں نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا بحیثیت افسانہ نگار کی مگر بعد میں نثر کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو ادب میں نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کے موضوع متنوع ہیں اُن کا تخلیقی ادب ہیئت و تکنیک، منفرد موضوعات اور غیر روایتی انداز بیاں سے عبارت ہے۔ اُن کے افسانے اُن کے عمیق مشاہدے، دقیق نظر، فہم وادراک، ادق تجربے اور وسیع مطالعہ کے عکاس ہیں۔ ڈاکٹر شمیم روشن آرا اُن کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''بانو اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتی ہیں جس کی وجہ سے وہ ہر شخص میں جھانک کر دیکھتی ہیں اور پھر اس کو صفحہ قرطاس پر اتار دیتی ہیں۔ جب قاری اس تحریر کو پڑھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اس کے ساتھ یا اس کے ارد گرد کے انسانوں کے ساتھ بیت رہا ہے۔'' (۱)

بانو قدسیہ کی افسانہ نگاری میں تہذیبی و ثقافتی بوقلمونی، ماضی کی مضبوط روایات و اقدار، موجودہ عہد کا کھوکھلا پن، دیہاتیوں کی سادہ لوحی رسم و رواج، بدلتی ہوئی قدروں کی مکارانہ سوچ اور جدت پسندی، عائلی زندگی میں موجود جنسی شقاوت، مذہبی و روحانی عقائد اور سیاسی بکھیڑوں کو بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ معاشرے کی تہذیبی روایات کی من و عن عکاسی کرتی ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ترقی یافتہ اور غالب اقوام کی تہذیب بہت جلد دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے ان کا رہن سہن، سماجی اقدار اور تہذیبی برتری عموماً ترقی پذیر اقوام کے رسم و رواج، رہن سہن اور ان کی فکر کے زاویوں کو نہایت شدت کے ساتھ متاثر کرتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی عوام عموماً یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ ترقی یافتہ ممالک کی تہذیبی و ثقافتی ترقی کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں اور ان قوموں نے یہ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ترقی کیوں کر حاصل کی۔ وہ ان کے کلیات پر عمل پیرا ہونے کی بجائے ترقی یافتہ ممالک کے رسم و رواج، عادات و اطوار، رہن سہن اور طرزِ زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے بانو قدسیہ اپنے افسانے ''حسن خاتمہ'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''سب سے پہلے لندن میں مستقل طور پر منتقل ہونے پر اسے اپنے لباس اور زبان پر ہی تو اعتراض ہوا تھا۔ یہ کیا دو ٹانکوں والی ستھن، چاکوں والی قمیض، اوپر سے دوپٹے کا بھی دُم جھلا۔ آدمی کتنا غیر مہذب لگتا ہے ایسے لباس میں۔۔۔۔ اوپر سے اسلام وعلیکم، اسلام وعلیکم۔۔۔ اسلام وعلیکم کہتے کتنے اولڈ فیشنڈ لگتے ہیں۔'' (۲)

حالانکہ تمدن و تہذیب یافتہ ہونے کے لیے اعلیٰ اقدار، روحانی برتری اور سماجی روایات کا استحکام ضروری ہے۔ لباس اور زبان کسی بھی تہذیب کا طرہ امتیاز ہوتا ہے اور اس پر شرمندگی محسوس کرنا تہذیبی زوال اور تنزلی کی علامت ہے۔ اسی تہذیبی تنزلی و پامالی کے باعث عصرِ حاضر کی نوجوان نسل، بے راہ روی، تذبذب اور عجب بے چینی کا شکار ہے۔ اپنی خواہشات و تفکرات کو عملی جامہ پہچانے کی راہ میں مذہب کی دیوار مائل ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی معاشرت اور تہذیبی روایات اس آزادی کی متحمل نہیں ہو سکتی جو مغربی سماج فراہم کرتا ہے۔ جدید تہذیبی شعور سے نابلد بے راہ رو نوجوان نسل کی عکاسی کرتے ہوئے بانو قدسیہ یوں لکھتی ہیں:

> ''اِن لڑکے اور لڑکیوں میں ایک بات ضرور ملتی جلتی ہے۔ وہ سب ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا شکار تھے۔ یہ اندر باہر کہیں پہنچنا ضرور چاہتے تھے لیکن ان میں نہ تو لگن تھی نہ ہی وہ مسلسل محنت کے عادی تھے۔ کچھ دور تک تو وہ ہر خیال کے پیچھے بھاگتے لیکن پھر خوابوں کے خول میں چلے جاتے۔۔۔ یہ نہ تو پورے مشرقی تھے نہ پورے مغربی۔''(3)

نظم وضبط، سیاسی استحکام اور سیاسی اصولوں وضوابط کسی بھی تہذیب کا اہم عنصر ہیں۔ سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ یہ سیاست دان نظم وضبط قائم کرنے والے ادارے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ تمام شعبہ جات کے نشیب وفراز سے واقفت رکھیں اور عوامی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں۔ ریاستی اداروں کو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ ایسے قوانین کو نافذ کیا جانا چاہیے جو عدل انصاف پر مبنی ہو تاکہ افراد تہذیبی ارتقاء میں اہم کردار ادا کر سکیں۔

بد قسمتی سے ہمارے ملک میں نظم وضبط، تنظیم اور سیاسی استحکام میں لانے والے یہ لوگ انسانیت کی خدمت سے عادی صرف اپنی نمود و نمائش کا ڈنکہ بجانے والے ہیں۔ اس میدان میں قدم رکھنے والے زیادہ تر افراد غیر تعلیم یافتہ اور جرائم پیشہ ہیں جو دولت اور طاقت کے بل بوتے پر اقتدار سنبھالتے ہیں اور انسانیت کشی سے بھی دریغ نہیں کرے۔ ہماری تہذیبی اور ثقافتی تنزلی کا باعث قوانین کا عدم نفاذ ہے۔ ہمارے معاشرے میں دولت کے بل بوتے پر سیاسی مسندوں پر فائز ہونا اور سیاسی ایوانوں تک رسائی بہت آسان، فقط دولت، رشوت اور سفارش کی بنیاد پر کامیاب ہونے والوں کی حقیقت کو بانو قدسیہ اپنے افسانے ''مجرا'' میں یوں بے نقاب کرتی ہیں:

> ''کیا مشکل ہے جی؟۔۔۔ نگار تنک کر بولی۔۔۔ مشکل یہ ہے کہ میں اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتا اور۔۔۔ اور۔۔۔ نگار نے فلک بوس قہقہہ لگایا اور وزیر کے ساتھ لٹک کر بولی۔۔۔ واہ جی وہ جو اسمبلیوں میں بھرے ہوئے ہیں وہ پڑھے لکھے ہوئے ہیں۔ واہ میاں جی واہ آپ نے تو وہی بات کی جس کے کندھے پر پنکھ نہ ہوں وہ فرشتہ نہیں ہوتا۔''(4)

بانو قدسیہ اپنی کہانیوں اور افسانوں کا تہذیبی مواد معاشرے کے رہن سہن، بودُ باش اور احساسات وجذبات سے لیتی ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیاں زندہ جیتے جاگتے لوگوں کے احساسات ہیں جو ہر قسم کے ملمع کاری سے پاک ہیں۔ ان کے تجربات حقیقت سے ہم آہنگ اور فطرت کے قریب ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ''بانو قدسیہ کے افسانے پاکستان کی معاشرتی زندگی اور متوسط طبقے میں فروغ پانے والے جذبات واحساسات کے افسانے ہیں۔ بانو قدسیہ کا افسانہ زندگی کی زمینی حقیقت سے جنم لیتا ہے اور معاشرتی آگہی کا آئینہ دار بن جاتا ہے''(5)

بانو اپنے معاشرے کا قلی طور پر احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان عوامل اور عنصر کی نشاندہی کی گئی ہے جو گھر اور معاشرے کی تعاو سالمیت کے لیے خطرہ میں گھر اور عائلی زندگی تہذیبی وثقافتی اقدار میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اگر ان میں دراڑیں پر جائیں تو معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عموماً گھروں میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور پھر غم وخوشی کے موقع پر تمام افراد پرانی رنجشیں بھول جاتے ہیں۔ معاملات تب خراب ہوتے ہیں جب کوئی تیسرا فرد یعنی باہر والا مداخلت کر کے معاملات کو خراب کر دے۔ اس حقیقت کی عکاسی بانو قدسیہ کچھ یوں کرتی ہیں:

> ''گھر کی بنیاد ہلانے والے گھر کے فرد نہیں ہوتے گھر کے سارے افراد ازل سے لڑتے جھگڑتے آتے ہیں لیکن وہ جدا نہیں ہوتے لیکن جب کوئی باہر کا چاہنے والا سیندھ لگا کر آجاتا ہے تو پھر گھر کے برخچے اڑ جاتے ہیں''(6)

بانو قدسیہ اپنے افسانوں میں عائلی زندگی کی تباہی اور میاں بیوی جیسے مقدس وپاک رشتے میں موجود کرواہٹ اور ناراضگی کو بھی بیان کرتی ہیں کہ کس طرح عدم اعتماد، محبت ولگاوٹ کی عدم دستیابی نفسیاتی الجھنوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ رشتہ ازدواج جو کہ باعثِ سکون ہونا چاہیے میاں بیوی کے لیے باعث آزار بن جاتا ہے۔ اکثر متکبر شوہر اپنی بیوی کی عزت نفس کو روندنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جیسا کہ ان کے افسانہ ''ابن آدم'' عائلی زندگی کے مسائل جذباتی ونفسیاتی الجھنوں کا عکاس ہے۔

> ''اسی لیے تو کبھی کبھی جب اسے ہجرت زدہ بچے بہت یاد آتے، اپنی بے معقدیت اور بے معنویت سمجھ نہ آتی تو سنگِ مرمر کے فرش پر جابجا اس کے آنسو چھٹے بن کر گرتے جنہیں دیکھ کر شاہد کو غصہ آجاتا اور وہ اونچی آواز میں تکبر سے کہتا۔۔۔ پتہ نہیں گھر کب منظم ہو گا۔ پانی کے چھینٹوں سے فرش کی خوبصورتی تباہ ہو جاتی ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ نہیں سیکھا جمیلہ۔۔۔

نہ پلاننگ، نہ وقت کا استعمال، نہ تجویز۔۔۔ مجھ سے سیکھو جمیلہ۔۔۔ مجھے مانو۔''(7)

گویا بیوی کی انفرادی زندگی اپنی صلاحتیں بے وصقت ہوں۔ تہذیبیں تب زوال کا شکار ہو جاتی ہیں جب ان کا گھریلو اور عائلی نظام تباہ ہو جائے۔ کسی نسل اور قوم کو تباہ کرنا ہو تو ان کا عائلی نظام تباہ کر دو۔ بانو قدسیہ کے فن کی یہ خوبی ہے کہ ان کے افسانوں کا مواد بیماری معاشرتی زندگی سے حاصل ہوتا ہے اور وہ اس چاشنی اور نفاست سے اس کا تانہ بانہ بنتی ہیں کہ قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ معاشرے کسی ایک طبقے اور گروہ کو بے نقاب نہیں کرتی بلکہ ہر طبقے کے احساسات وجذبات کو پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

خواندگی اور شرح تعلیم بھی تہذیب وثقافت کے اہم عناصر میں سے ایک ہے۔ بانو قدسیہ نے تعلیم کی کمی اور موجودہ دور میں اس کی صورتحال کو واضح کیا ہے۔ وہ اس سماجی حقیقت کی طرف بیماری توجہ مبذول کرتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں اکثر والدین اگرچہ ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ ہیں لیکن وہ بھی اپنے بچوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے اور انہیں بہتر سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچے تعلیم کی دولت سے مالامال ہو کر بہتر زندگی گزاریں لیکن وہی ماں باپ جو اولاد کی کامیابی کے لیے اپنا پیٹ کاٹتے ہیں وہی ماں باپ خود کو اپنے بچوں کے سامنے کمتر محسوس کرتے ہیں اور اپنے ہی بچوں سے خوف محسوس کرتے ہیں۔ ان کے بچوں کے رہن سہن میں واضح فرق آجاتا ہے۔

بانو قدسیہ اپنے افسانے ''بڑا بول'' میں اسی کیفیت کو بیان کرتی ہیں۔ اس افسانے میں چوہدرائن کی بیٹی عصمت شہر سے تعلیم حاصل کر کے جب واپس آتی ہے تو چوہدرائن جس کا پورے گھرانے پر رعب ودبدبہ ہے، عصمت سے دبتی ہیں وہ ان پڑھ ماں کی کیفیات کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

''چوہدرائن سب کو ڈانٹ ڈیٹ لیتی۔۔۔ لیکن عصمت کے سامنے
چوہدرائن ایسے پھرتی جیسے ڈبو کتا ٹانگوں کے اندر دم دبائے پھرتا ہے''(8)

وہ قومیں اور تہذیبیں تباہ ہو جاتی ہے جو اپنی روایات کی پاسداری نہیں کرتی وہ دوسری تہذیبوں کو بہتر اور برتر تصور کرتی ہیں۔ وہ معاشرہ جو اپنی سماجی اسالیب اور بودوباش میں منظم نہ ہو تہذیب یافتہ کہلانے کے مستحق نہیں۔ ان کی اخلاقی اقدار ہی انہیں مہذب بناتی ہین لیکن ہمارا المیہ ہے کہ ہم اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں۔ اپنی روایات پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور مغربی تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ اپنے افسانے ''نیو ورلڈ آرڈر'' میں ان تہذیبی تبدیلیوں کو بیان کرتی ہیں جس کے باعث ہماری تہذیب تنزلی کا شکار ہے۔

''موجودہ عہد کی زندگی نے جہاں بہت ساری چیزوں کو ختم کر دیا تھا وہاں یہ ذاتی فراغت کی موت کا باعث بھی ہوئی تھی۔ کھاتے پیتے گھرانوں میں بنک مارکیٹ، سوشل فنکشن، فیشن سیاحت کے لیے تو وقت تھا لیکن کتاب پڑھنے

میل جول کے لیے وقت نہ چھوڑا تھا۔ بچے بوڑھے بُری طرح متاثر ہو رہے تھے''(9)

اقدار میں یہ تبدیلی مثبت نوعیت کی نہیں بلکہ منفی ہے۔ ہم اس کوّے کی مانند ہیں جو نیس بننے کی خواہش میں اپنی چال بھی بھول چکا ہے۔ یہ زوال ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ دورِ جدید میں لوگ اپنی مذہبی روایات اقدار اور اخلاقی قدروں کو شرمندگی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''دیکھیے ڈاکٹر معظم کا بھی کوئی خاص قصور نہیں ہے۔ ملک سے باہر جا کچھ لوگوں پر ردِ عمل ہو جاتا ہے۔ اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے وہ زیادہ مذہب پرست ہو جاتے ہیں۔ اپنی پہچان قائم رکھنے کے لیے وہ زیادہ مذہب پرست ہو جاتے ہیں۔ اپنی پہچان قائم رکھنے کو وہ ضرورت سے زیادہ Rigid ہو جاتے ہیں۔ لیجئیے جو شخص امریکہ میں رہ کر زکوۃ دیتا ہے۔ بنک کا سود نہیں لیتا۔ عورتوں سے آشنائی نہیں رکھتا وہ تو پکا فنڈا منلٹسٹ ہوا ناں۔ اب جو شخص خود شرع کا اس حد تک پابند ہو، وہ بیوی سے بہت زیادہ توقعات رکھے گا''(10)

وہ لوگ جو اقدار و روایات کے پاسدار ہیں صحیح معنوں میں متمدن اور شائستہ ہیں وہ اکثر کم ظرف دولیتوں اور غیر تہذیب یافتہ افراد کی نظر میں ناقابل قبول بن جاتے ہیں۔ ان کے افکار و اقدار کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں فنڈا مینٹلسٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ ایک جگہ وہ اس احساسِ کمتری کو یوں بیان کرتی ہیں:

''مذہب کے پیروکار عام طور پر بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے ساتھ اوّل تو رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شخصی آزادی قدم قدم پر مجروح ہوتی ہے۔ پھر میرا خیال ہے کہ جو شخص مذہب کے فریم ورک میں رہتا ہے وہ نہ تو اچھا انسان ہوتا ہے نہ شوہر۔۔۔ یہ لوگ نہ تو خود آزاد ہوتے ہیں اور نہ کسی اور کو آزادی دے سکتے ہیں۔ گرفتار مذہب کا ساتھی بنا کر اسے آزمائشوں میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ انسان اپنی خواہشیں بھی پوری نہ کرے تو وہ یہاں آیا کیوں ہے۔۔؟''(11)

تہذیب سے عاری یہ افراد شخصی آزادی کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی بے راہ روی کو خواہشات کی تکمیل کا نام دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو دین کے رہتے ہیں اور نہ دنیا کے۔ مذہب تہذیب کو پروان چڑھانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے اور مذہب سے دوری انسان کو وحشی بنا دیتی ہے۔ مذہب ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر معاشرے کا توازن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے بانو قدسیہ ایسے غیر تہذیب یافتہ افراد سے کچھ یوں سوال کرتی ہیں:

''کیا نیو ورلڈ آرڈر میں مذہب کی گنجائش نہ تھی۔۔۔ کیا ایسے لوگ جو مذہب سے وابستہ تھے، آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔۔۔؟ کیا نیو ورلڈ آرڈر صرف ہیومن رائٹس کی لاٹھی ٹیک کر چلنا چاہتا ہے''(۱۲)

بانو قدسیہ قدیم تہذیبی روایات اور اقدار کی دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ دو اجدید میں ان روایات کی بحالی کی خواہ ہیں۔ وہ عہد رفتہ کی روایات کے Nostalgis میں مبتلا ہیں ان کا افسانہ شہر کافور'' ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ وہ ان تہذیبی و ثقافتی روایات کو کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

''ہمارے بزرگ فارسی میں شعر کہتے تھے فارسی کا ملکہ خواتین میں بھی تھا اور وہ نوکر اپنوں کے درمیان ذاتی گفتگو فر فر فارسی میں کرتی تھیں جسے آج کل کالونی میں انگریزی استعمال کی جاتی ہے۔۔۔ تمام مرد کیروے رنگ کی پگڑی پہنتے، سردیوں میں۔۔۔ اور چوغے بھی اسی رنگ کے اوڑھتے۔۔۔ اسی طرح حویلی کے لوگ عوام سے بچھڑ کر بالکل منفرد نظر آتے تھے علم دولت کے علاوہ لباس نے بھی اس آبادی میں حویلی والوں کی چڑھ مچا رکھی تھی۔ لیکن سُنا ہے اتنی عزت و توقیر کے باوجود ہمارے گھروں میں اسرافِ بے جا پر سخت لغت بھیجتے تھے۔ اونچی آواز میں بولنا گناہ تھا۔ لگائیں جھکا کر چلنے اور آپے میں رہنے کا دستور تھا۔''(۱۳)

درج بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بانو قدسیہ نے افسانوں میں برِ صغیر کی تہذیب و ثقافت کو بالعموم اور پنجاب کی ثقافت کو بالخصوص دکھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانے کی شعریات کو متاثر کیے بغیر انھوں نے فنی مہارت سے یہ مشکل کام سرانجام دیا ہے جو ان کی افسانے پر گرفت کی دلیل ہے۔

حوالہ جات

1. شمیم روشن آرا، ڈاکٹر، بانو قدسیہ کے افسانے، حقیقت کے افسانے، مشمولہ: زبان وادب، فیصل آباد: شمارہ ۱۱، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص:۱۳
2. بانو قدسیہ، سامان وجود، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص: ۶۸۱
3. بانو قدسیہ، آتش زیر پا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء، ص:۵۶۱
4. بانو قدسیہ، دست بدست، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۵ء، ص: ۷۱
5. انور سدید، ڈاکٹر، بانو قدسیہ شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء، ص:۸۵
6. بانو قدسیہ، توجہ کی طالب، ص:۵۷۱
7. بانو قدسیہ، سامانِ وجود، ص:۲۸
8. بانو قدسیہ، ناقابل ذکر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۹۱۱
9. بانو قدسیہ، سامانِ وجود، ص:۵۳
10. ایضاً، ص:۵۷
11. ایضاً، ص:۵۸
12. ایضاً، ص:۵۸
13. ایضاً، ص:۷۷